۱۸۵۷

جن بہادر اور اولوالعزم مجاہدین نے ۱۸۵۷ء کی
جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا،
اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی
ان کے مستند و مفصل سوانح حیات ـــ اردو زبان میں پہلی
اور یگانہ کتاب

اٹھارہ سو ستاون کے

مجاہد

غلام رسول مہر

1 جعفر تھانیسری انڈمان بھیجے گئے — یہ میرزا امیر احمد کا ساتھ دینے میں ہوئی — 8, 295

2 مہر — میں فرقہ وار تفریقات کا قائل نہیں — 10

3 جنرل بخت خان — 22/63

4 انقلابیوں نے شکست کھائی — 63, 67

5 تاریخی واقعات میں قیاسات یا افسانہ سازیوں کیلئے قطعاً گنجائش نہیں — 80

6 مولوی امام بخش — — 108

7 مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ — سرکاری ملازم — 111

8 وہابی — بخت خان — وہابی کا لفظ — 166/167

9 مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کا فتویٰ — 181, 206

10 مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ اور اسماعیل دہلوی — 203

11 پادری فنڈر — عربی فارسی میں مہارت تھی — 240

12 علماء کے نزدیک یہ ہنگامہ مذہبی جہاد تھا — 244

13 دیوبند نے جنگ آزادی میں حصہ لیا — 250

14 مہر صاحب کی تذکرۃ الرشید کی صفائی پیش کرنا — لفظ سرکار — 254

۱۸۵۷ کے مجاہد

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

اشاعت سوم ــــــــ ۱۹۷۰ء

اشاعت چہارم ــــــــ ۱۹۸۲ء

اشاعت پنجم ــــــــ ۱۹۹۱ء

مقامِ اشاعت:
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز،
۱۹۹۔سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲/۵۴۰۰۰
ISBN – 969 – 31 – 0146 – 4

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

"۱۸۵۷ء" کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا، جسے اب پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً بعض ممتاز مجاہدینِ آزادی کے حالات سامنے تھے لیکن یہی تصور کیے بیٹھا تھا کہ عام واقعات کے سلسلے میں وہ حالات بھی آجائیں گے یا ضرورت محسوس ہوگی تو مناسب مقامات پر چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جنسوں میں امتزاج پیدا کیا جائے۔

بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔ جن عزیمت دوست اور حمیت پرور شخصیتوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں مقصدِ آزادی کے لیے وقف کیں، ان کی ایک بڑی یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے سوانح مرتب ہو جائیں اور عام لوگ ان سے عزیمت و حمیت کے سبق لیں۔ یہ حقیقت بھی محتاجِ تصریح نہیں کہ سیر و سوانح کے ذریعے سے قوموں کے لیے بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے غالباً فراہم نہیں

ہو سکتا۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اعتراف نہ کروں کہ مجھ سے پیشتر بھی بعض اصحاب نے اس کام کے سرانجام کی کوشش کی، لیکن اول معلومات کا سرمایہ بہت معمولی تھا۔ دوم انداز ترتیب شخصیتوں کی عظمت کے شایان شان نہ تھا۔ سوم شخصیتوں کے انتخاب میں ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی پر حصر نہ کیا گیا بلکہ بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر دیا گیا جو یقیناً حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پاکر انڈیمان پہنچیں، تاہم یہ ابتلا ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں پیش نہ آئی تھی۔ بلکہ وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا مثلاً:

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری یقیناً انڈیمان بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزار دیئے، تاہم یہ سزا سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں ہوئی تھی نہ کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں۔

۲۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی محولہ بالا "جرم" میں سزایاب ہوئے تھے، نہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں شرکت کے باعث، اگرچہ مولانا محمد جعفر کے متعلق ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں چند آدمیوں کے ساتھ دہلی پہنچے تھے اور چند روز وہاں لڑے نیز مولانا احمد اللہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کچھ مدت نظر بند رہے تھے۔

۳۔ منیر شکوہ آبادی کو بھی یقیناً انڈیمان بھیجا گیا تھا لیکن انھیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کہ مصطفےٰ بیگ نام ایک شخص نے نواب جان طوائف کو قتل کر کے تزویر سے منیر کو الجھا لیا تھا چنانچہ منیر اپنے طویل قصیدۂ ابتلائیہ میں کہتے ہیں:

مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے
کج روی میں بڑھ گئے چور شرپر سے
کر کے خونِ ناحقِ نواب جاں
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

ہے کہیں کہیں فروگزاشتیں محسوس ہوں یا بعض پہلو تشنۂ تکمیل نظر آئیں تاہم اُمید ہے کہ خوانندگان کرام اس کتاب کو مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کا بالکل نیا مرقع پائیں گے۔

یہ اُن بلند ہمت اور اولوالعزم شخصیتوں کے سوانح ہیں جنھوں نے اس دَور میں آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی، جب اصل مقصد کے لیے تحسین وستائش کا اندازہ بھی عوام کے ذہنوں میں صورت پذیر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی غرض یہ تھی کہ دنیا کی زبان پر ان کے کارناموں کی مدح کے ترانے جاری رہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو جائے۔ اور اجنبی حکومت کا نقشِ باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ انھوں نے شدید تاریکی میں زندگی کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اپنا خونِ حیات اس بے پروائی سے بہایا، دوسروں کو شاید اس طرح پانی کے چند چُلو بہانے میں بھی تکلف ہو۔

ان کے کارناموں پر ایک سَو سال کی مدت گذر چکی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی غالباً اکثر اصحاب کو معلوم نہ ہوں۔ انگریزوں نے اقتدار و تسلط بحال ہو جانے کے بعد ان مساکین کی بے مثال قربانیوں کے مراز نے کا موقع ہی نہ آنے دیا، لیکن خلوص و بے نفسی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی قدرت ضائع نہیں ہونے دیتی۔ انھوں نے تو بہت بڑے عمل کے لیے قدم اٹھایا تھا اور جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر آج سب کے سامنے ہے۔ حق و انصاف کی میزان کا فیصلہ یہی ہے کہ انھوں نے جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا تھا اور اسے اپنی زندگی کے لہو سے سینچا تھا، وہ نوّے سال کے بعد پھل لایا۔ انگریزی حکومت اپنی بے پناہ قاہری کے باوجود مٹ گئی۔ آج ہر احسان شناس قلب میں ان مجاہدین کی یاد تازہ ہونی چاہیے جو ایک سَو سال پیشتر انتہائی مشکلات میں اپنا فرض احسن طریق پر بجالاتے ہوئے خوفناک مبرآزمائیوں کی منزل سے کامیاب و کامگار گزر گئے۔

میں ادائے فرض کے سلسلے میں فرقہ وار تفریقات کا قائل بھی نہیں اور انھیں پسندیدہ بھی نہیں سمجھتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر اور صدر درجہ ممتاز حصہ مسلمانوں

نے لیا، بلاشبہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جوشِ آزادی کی بے گرانی اور قربانیوں کی
فراوانی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے لوگ باوجود کثرتِ تعداد ان سے منزلوں پیچھے رہ گئے
یہ اس دور میں مسلمانوں کی شانِ امتیاز تھی، جب اس ملک پر بے حسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء
کے جہادِ آزادی میں جس قوم کا حصہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور جس نے مایعنی ناکامی کے بعد
نقصان بھی سب سے زیادہ اٹھائے، کیا یہ امید بے جا سمجھی جائے گی کہ اس جہاد کی یادگار منانے
کی سب سے بڑھ کر حق دار قوم وہی ہے؟

مسلم ٹاؤن - لاہور
۱۰ مارچ ۱۹۵۷ء

ہنری لارنس تمام معاملات کا مالک و مختار تھا۔ وہ ۲ رجولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر زخمی ہوا اور مرگیا اس کے بعد محصورین سے بیلی گارد خالی کرالینا قطعاً مشکل نہ تھا، کیونکہ وہاں کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

۲۔ جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کانپور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع کی، لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳۔ ۴ر اگست اور ۱۲ر اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی کی، لیکن دونوں مرتبہ مراجعت ہی پر مجبور ہوا۔

۴۔ ہیوے لاک کی جگہ آؤٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵۔ نومبر میں سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہوا لیکن کانپور کے حالات اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس چلا گیا۔

۶۔ فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہوا۔

گویا اہلِ لکھنؤ کو کم و بیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے بے اثر و رسوخ اور عزم و ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لیے موجود ہوتا!

فوج کی دل دہی

مختلف لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اُسے بہت رنج ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا۔ توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو میں تمہیں اور دوں گی[۱]۔ ۲۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہیوے

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۱۲

سکینؔ[1] اور کپتان گارڈن[2] کو مشورہ دیا کہ فوراً دتیا چلے جائیں اور اپنے آپ کو وہاں کے راجا کی حفاظت میں دے دیں، لیکن یہ بھی نہ کیا گیا! انجام کار انھیں ہماری فوج، پولیس اور جیل کے ملازموں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[3]

یہ خط واقعہ قتل سے رانی کی برأت کا روشن ثبوت ہے۔

تین لاکھ کا مطالبہ

کن کیڈ کا بیان ہے کہ قلعے کے تخلیے اور انگریزوں کے قتل سے فراغت کے بعد تمام انقلابی رانی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم دہلی جانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے دیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میں تین برس ہوئے ریاست سے الگ ہو چکی ہوں میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟ یہ جواب درست تھا۔ رانی کے پاس حقیقتاً نقد روپیہ نہ ہو سکتا تھا خصوصاً اس لیے کہ جو پنشن اسے ملتی تھی، اس میں سے متوفی راجا کے قرض کے روپے بالاقساط کٹتے جاتے تھے۔ نیز اس واقعے سے ثابت ہے کہ نہ رانی نے انقلابیوں کے کسی فعل میں حصہ لیا تھا اور نہ وہ اُنھیں اُکسانے اور برانگیختہ کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اگر ایسا ہوتا

---

[1] SKENE جھانسی میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔

[2] GORDON جھانسی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔

[3] کن کیڈ کی کتاب ص ۱۲، ۱۳۔ خط سے ظاہر ہے کہ مارٹن خود محاصرے کے وقت قلعے میں موجود تھا وہ کس طرح بچ نکلا؟ اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ رانی کے بھیجے ہوئے، بند وقچیوں کو اس لیے باہر بھیج دیا ہوگا کہ انگریز ان پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ تاہم رانی اس کے سوا ان کی کیا مدد کر سکتی تھی؟ مارٹن کے اس خط کا سراغ نہیں مل سکا، مگر رانی کا مرہٹی سوانح نگار لکھتا ہے کہ میں نے خود یہ خط دیکھا تھا جو غالباً دامودر کے بیٹے کے پاس تھا، اور وہ اہل بازار، اندور میں رہتا تھا۔ اس کا ذکر ایس۔ این سین نے بھی کیا ہے (۱۸۵۷ء انگریزی ص ۲۷۹، ۲۸۰)

تو انقلابی اس انداز میں روپے کا مطالبہ کیوں کرتے!

تاہم انقلابی ایسے کسی جواب پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے کہ رانی کے متبنیٰ دامودر، گنگادھر راؤ رقیب یعنی رام چندر راؤ کا متبنیٰ سداشیو راؤ ریاست کا طلب گار بیٹھا ہے چنانچہ انھوں نے رانی سے کہہ دیا کہ اگر تین لاکھ نہ ملیں گے تو ہم محل کو آگ لگا دیں گے اور سداشیو راؤ کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیں گے۔

رانی کے لیے یہ دھمکی سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ محل کو آگ لگ جاتی تو جو اندوختہ اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، وہ جل جاتا۔ نیز انگریز اگرچہ جھانسی پر قابض ہو چکے تھے۔ تاہم رانی کو امید تھی کہ ریاست اُسے واپس مل جائے گی۔ اگر سداشیو راؤ مسند نشین ہو جاتا تو رانی کی یہ امید بھی ختم ہو جاتی۔

اعلانِ حکومت

بہ ہر حال اس دھمکی سے متاثر ہو کر اُس نے ایک لاکھ کے جواہرات انقلابیوں کے حوالے کر دیے۔ جواہرات مل گئے تو انھوں نے رانی کی حکومت کا اعلان کر دیا اور منادی ہو گئی: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا۔[۱]

حقیقت میں وہ دامودر کی مختار و سرپرست تھی، نہ کہ مستقل حکمران۔ یہ امر بہ طورِ خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رانی نے اپنی حیثیت سے کبھی تجاوز نہ کیا اور دامودر کے حقوق کو کبھی خفیف سا گزند بھی نہ پہنچنے دیا۔ بلکہ وہ جب تک زندہ رہی، اس نے دامودر کو سینے سے لگائے رکھا اگر کوئی بچہ رانی کے بطن سے بھی ہوتا تو اس سے زیادہ پیارا اور ممتا کا مرجع ہرگز نہ بن سکتا، جس کے مظاہرے رانی لکشمی بائی نے دامودر کے تعلق میں کیے۔[۲]

رانی کی پوزیشن

اب یہاں اس امر پر تھوڑی سی گفتگو کر لینی چاہیے کہ رانی کی پوزیشن کیا تھی؟ ہم نے مانا کہ واقعات قتل کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی

---

[۱] کن کیڈ ص ۷۵   [۲] ساورکر ص ۱۱۶

تھی۔لیکن کیا اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے کہ رانی نے فوجیوں کو سرکشی پر ابھارا یا خود انھیں بطیبِ خاطر کوئی امداد دی ؟ کیا اس بات کی کوئی شہادت ملتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف لڑنے پر تلی بیٹھی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اس کے لیے ایک عمدہ موقع بہم پہنچا دیا تھا ؟ مستند تاریخی وثیقوں کے مطابق ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

واقعات کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ ۵ رجون کو جھانسی میں ہنگامہ برپا ہوا۔ رانی کا اس ہنگامے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پاس صرف سو پچاس آدمی تھے، وہ کسی ہنگامے کی روک تھام کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے۔

۱۔ انگریزوں نے جتنے گواہ مہیا کیے، ان میں سے کسی ایک کا بیان رانی کو کسی بھی درجے میں مجرم ثابت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ان بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل بے قصور تھی۔

۲۔ امان اللہ خاں سپاہی کو وسطِ ہند کا پولٹیکل ایجنٹ رابرٹ ہیملٹن قابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ سرکشی سے قبل کسی نے رانی سے مشورہ نہ کیا۔ پھر ڈرا دھمکا کر دوسروں کو ساتھ ملایا اور وہ لوگ رانی کے محل کی طرف گئے تو بھری ہوئی توپیں ساتھ لے گئے۔ گویا بزورِ رانی سے روپے اور آلات و اسلحہ کی مدد حاصل کی۔

۳۔ ۱۲رجون کو سرکشوں نے دہلی کا راستہ لیا۔ اس وقت سے رانی نے انگریزوں کے پاس مفصل اطلاعات بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے ساگر اور بندھیل کھنڈ کے پولیٹکل ایجنٹوں یا آس پاس کے دوسرے ذمہ دار انگریزوں کے پاس رپورٹیں بھیجیں۔ جب اس کے خلاف اوڑچھا کے راجا نے فوج کشی کی تو انگریزوں سے مدد مانگی۔ ایک پولیٹکل ایجنٹ نے اسے لکھ بھی دیا تھا کہ مالیہ وصول کرو، فوج بھرتی کر لو اور انتظامی کاروبار جس حد تک ممکن ہو سنبھالے رکھو۔

۴۔ جب رانی کو یقین ہو گیا کہ دشمنوں کی در اندازی سے انگریز اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں اور جھانسی کا نام سنتے ہی ان پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ رنج دہ واقعات کے لیے وہ ذمہ دار نہ تھی تو اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا جو ہر لحاظ سے عزیمت اور غیرت و حمیت کے عین مطابق تھا۔ پھر وہ زندگی کے آخری سانس تک اسی پر چٹان کی طرح جمی رہی۔

حقیقت سے اعراض کیوں؟

حقیقت یہی ہے جو ہم نے صاف صاف عرض کر دی۔ اس کا کوئی پہلو رانی کی عظمت کے منافی نہیں۔ ہمیں نہ افراط کا شکار رہنا چاہیئے اور نہ تفریط کا۔ نہ رانی کو ابتدا ہی سے انگریز دشمنی کا پیکر بنا کر پیش کرنے کے درپے ہونا چاہیئے اور نہ ایک خاص وقت تک انگریزوں سے لڑنے میں تامل کی بنا پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ رانی کو جنگ آزادی میں علمبرداری کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ ابتدا میں ہرگز لڑنا نہ چاہتی تھی مگر جب اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا تو ایک لمحے کے لیے بھی تذبذب کو راہ نہ دی اور خطرے کے ہر مقام میں سب سے آگے رہی۔ اس عزیمت پر کون فخر نہ کرے گا اور اس مردانگی کے لیے کس کے دل کی گہرائیوں سے تحسین و آفرین کی لہریں نہ اٹھیں گی!

ضروری نہیں کہ ہر انسان پہلے ہی مرحلے میں تمام حقائق کا صحیح اندازہ کر لے۔ جب اندازہ ہو جائے تو پھر جان و دل سے راہ عمل پر گامزن ہو جانا منافی عظمت نہیں بلکہ یہ بہر حال مستحق تحسین ہے۔ یقیناً رانی بڑی عظیم المرتبت تھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس کی شان عظمت کا مقابلہ احمد اللہ شاہ یا شہزادہ فیروز شاہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے انسان جان بازی کا نہ محض عہد کرلے بلکہ بے تامل جان دے دے تو کون ہے جس کے دل میں اس قربانی کے لیے انتہائی احترام کا جذبہ پیدا نہ ہو گا؟ رانی نے آزادی کے لیے میدان جنگ میں جان دی۔ کیا یہ برتری اور عظمت کی سب سے بڑی دستاویز نہیں!

انگریزوں سے لڑوں حقیقت یہ ہے کہ اب رانی کے سامنے انگریزوں کے قلع قمع کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ جھانسی سے بے دخل ہو چکی تھی۔ ۲۱ مارچ سے ۴ اپریل تک اپنے بہادروں کو آزادی کے لیے بے دریغ جانیں قربان کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ یا تو اصل مقصد کو پورا کرنے کی آرزومند تھی یعنی انگریزوں کا استیصال یا چاہتی تھی کہ خود بھی میدان جنگ میں جان دے دے۔

تانتیا ٹوپے بھی کالپی ہی آ گیا تھا۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ ان کے روبرو پُرجوش تقریر کی۔ پھر تانتیا ٹوپے کو سالار بنا کر ہدایت کی کہ انگریزی فوج کے مقابلے پر نکلے تانتیا فوج لے کر کونچ پہنچا، جو کالپی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر جھانسی کی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رانی بھی تانتیا کے ساتھ گئی۔

ہیوروز نے جھانسی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۲۰ اپریل کو کالپی کی جانب کوچ کیا۔ ۶ مئی کو اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ تانتیا نے شکست کھائی اور رانی کے لیے کونچ میں ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ پھر کالپی چلی گئی۔ تانتیا والدین سے ملنے کے لیے چرکی پہنچ گیا۔[۵] کالپی میں سخت مقابلہ ہوا لیکن انقلابیوں نے وہاں بھی شکست کھائی اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انقلابی فوج بے ترتیب تھی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ نیز سالاری اور قیادت کے جوہر سب سے بڑھ کر رانی لکشمی بائی میں موجود تھے لیکن اُسے خودمختاری کے ساتھ جنگ کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔

---

۵ میل سن کا بیان ہے کہ فوج کے تمام طبقے کونچ کی شکست کا ذمہ دار تانتیا کو ٹھہراتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ جھانسی کے رسالے نے بھی حق استقامت ادا نہ کیا۔ ہر رسالے کے سوا یہ فیلڈ کرتے تھے کہ ہمارے لیے رانی کا بچاؤ ہر شے پر مقدم تھا (جلد پنجم ص ۱۲۵) اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ میرا تاثر یہی ہے کہ تانتیا میدان عمل میں گھبرا جاتا تھا۔

ساورکر کا بیان ہے: تانتیا نے اگرچہ ظاہر یہ کیا تھا کہ والدین سے ملنے جا رہا ہوں، لیکن حقیقتاً وہ اس فکر میں تھا کہ اگر کالپی کو خالی کرنا پڑا تو کوئی دوسرا مرکز تیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ گوالیار گیا۔ درباریوں، سرداروں اور دوسرے اکابر سے مل کر انھیں ہم نوا بنایا، پھر راؤ صاحب کے پاس جا کر گوالیار پہنچنے کی تحریر پیش کی:

> ۳۰ مئی کو انقلابی محل پہنچے۔ محل کے کارداروں نے انھیں روکنا چاہا۔ انقلابیوں نے جواب دیا: تم روکنے والے کون ہو؟ ہم پیشوا کے نمائندے ہیں۔ ہم سوراج اور سودھرم کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہاں دنیا کو جان لینا چاہیے کہ ہم پیشوا ہیں۔ ہماری جنگ سوراج اور سودھرم کے لیے ہے۔[۱]

جنگ مرار

انگریزی فوج تخلیہ کالپی کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ اب زیادہ لڑائی بھڑائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ لیکن جب سنا کہ انقلابی گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو ہیوروز خود کالپی سے چلا۔ برگیڈیر سمتھ کو جو چندیری کے قریب تھا حکم بھیجا کہ جلد سے جلد کوٹہ کی سرائے پہنچو، جو گوالیار سے پانچ میل جنوب میں ہے۔ ۱۶ جون کو رابرٹ نیپیر بھی ہیوروز سے آ ملا۔ یہی انگریز جرنیل ہے جس نے بعد ازاں وسطی ہند میں انقلابیوں سے لڑائیاں کیں۔ اسی نے تانتیا کو گرفتار کیا تھا۔ اُسے بعد ازاں لارڈ نیپیر آف میگڈالا کا خطاب ملا۔

سندھیا کے آدمی ہیوروز کی رہبری کر رہے تھے۔ وہ مرار پہنچا تو اچانک اس پر گولے اور گولیوں وغیرہ کی بارش شروع ہو گئی۔ تاہم تھوڑی دیر میں مرار کی انقلابی فوج نے شکست کھائی۔ ہیوروز اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔

---

[۱] ساورکر ص ۴۰۹۔ ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ گوالیار کا نائب کوتوال بٹھور کا باشندہ تھا۔ جو نانا صاحب اور پیشوا باجی راؤ کا وطن تھا۔ تانتیا کا داماد بھی گوالیار ہی میں رہتا تھا۔ نائب کوتوال سے بہرحال امداد و اعانت ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔

آخری رسوم

اب رانی کے آخری سانس تھے۔ اس کا وفادار ملازم رام چندر راؤ دیش مکھ قریب ہی تھا۔ وہ اس شیر دل مجاہدہ آزادی کو اٹھا کر پاس کی جھونپڑی میں لے گیا۔

گنگا داس باوا نے پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پلایا اور بستر کا انتظام کر دیا۔ یُرن جنگ کی یہ دیوی خون میں نہائی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا مُرغِ روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گیا۔ رانی نے مرتے وقت جو ہدایات کی تھیں، ان کے مطابق رام چندر راؤ نے دشمن کی نگاہوں سے بچ بچا کر گھاس کا انبار فراہم کیا، اس پر رانی کی ارتھی رکھی۔ رانی کا مردہ جسم آگ کی نذر ہو گیا۔[1]

تانتیا نے گرفتاری کے بعد اپنے سوانح کے متعلق جو یادداشت تیار کی تھی اس میں لکھا تھا کہ رانی کی ارتھی رام راؤ گوبند نے جلائی تھی۔[2]

ملازم کی زبانی

فارسٹ لکھتا ہے کہ رانی کی وفات کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں، لیکن اس کے ملازم کا بیان زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ ذیل میں درج ہے!

رانی کا معمول تھا کہ مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کرتی۔ سُرخ کوٹ، سُرخ پتلون اور سفید پگڑی۔ اس لباس میں کوئی شخص اس کی صنف نہ پہچان سکتا۔ اس کے متوفی شوہر کی برہمن خواص گرا ایری فوج کے لباس میں ہر لحظہ ساتھ رہتی تھی۔ وہ دونوں (رانی اور خواص) اپھول باغ کے دمدمے کے پاس بیٹھی ہُوئی شربت پی رہی تھیں۔ بے قاعدہ پلٹن کے چار سو آدمی قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت

---

[1] ساورکر ص ۴۰۰، بیان تانبا رانی کے مرہٹی سوانح نگار کی کتاب پر مبنی ہے۔ جس نے واقعات کی خوب چھان بین کی تھی۔

[2] میل سن جلد ۳ ص ۴۰۰ (ضمیمہ ب)

خطرے کا بگل بجا کر (انگریزی فوج کے) مسلح سوار آ پہنچے۔ وہ چالیس پچاس ہوں گے "باغی" بھاگ نکلے۔ صرف پندرہ کے قریب اپنی جگہ جمے رہے۔ رانی گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اس کے گھوڑے نے نہر کود جانے میں تامل کیا۔ اس وقت رانی کے پہلو میں گولی لگی۔ پھر سر پر ایک زخم آیا۔ لیکن وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں دم نکل گیا اور گر پڑی، اور پاس ہی کے ایک باغ میں اس کی ارتھی جلائی گئی اس وقت برہمنی خواص کے چہرے پر بھی تلوار کا زخم آیا لیکن شہر تک پہنچ گئی۔ ایک فقیر اور مسلمان کوتوال نے اس کی تیمارداری کی۔ انھیں ہاتھوں میں وہ مری، اور نومسلمہ کی حیثیت میں اُسے دفن کیا گیا[1]

ڈاکٹر سین

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ رانی کے گولی لگی۔ تانیتا اور راؤ صاحب بھی پاس تھے۔ بیس منٹ بعد اس نے وفات پائی۔ اسے اُٹھا کر پھول باغ کی طرف لے گئے۔ راؤ صاحب پاس تھے۔ پھر لاش کو پالکی میں لٹایا گیا۔ تلیے اور پھول باغ کے درمیان جو ندی ہے اس پر لے گئے۔ وہاں بہ اطمینان آخری رسم ادا کرنا ممکن نظر نہ آیا تو لاش کو اٹھا کر دیوار پر سے باغ کے اندر پہنچایا اور ایک درخت کے نیچے جلانے کا انتظام کیا۔ ابھی رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ انگریزی فوج کا حملہ ہو گیا۔ جو لوگ رسم چھوڑ کر بھاگے ان میں سے چھ سات مارے گئے۔ بہ ہر حال لاش جل چکی تھی لیکن پھول چنے نہ گئے تھے[2]

رانی کی شخصیت

رانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کشیدہ قامت، نہایت حسین و جمیل حد درجہ سرگرم و مستعد، خود دار اور دھن کی پکی تھی۔ جھانسی سے گوالیار تک ہیوروز کو جتنی لڑائیاں پیش آئیں، قریباً ان سب میں رانی سے مقابلہ ہوا۔ لہٰذا

---

[1] فارسٹ جلد سوم ص ۲۸۰-۲۸۱ ہومز نے بھی لکھا ہے کہ رانی کی وفات قرابین کی گولی لگنے سے ہوئی تھی

[2] ایضاً ص ۲۹۵

غور طلب اُمور

گو یہ اب کا اتفاق ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں عظیم اللہ خاں نے اس انگریزی گھرانے میں سیکھیں، جہاں وہ ادنیٰ حیثیت میں ملازم ہُوا تھا۔ پھر سکول میں داخل ہُوا اور معلم بنا۔ انگریزی کا سیکھنا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن فرانسیسی کس ذریعے سے سیکھی اور کیوں کر اس میں کمال پیدا کیا؟ کیا اس انگریز گھرانے میں فرانسیسی بھی بولی جاتی تھی یا کیا گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی!

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کو فرانسیسی سے کیوں دلچسپی پیدا ہُوئی جبکہ اس زبان میں مہارت پیدا کر لینے سے اُسے اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکتی تھی!

ہمارے سامنے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم یہ واقعہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کا حافظہ بڑا ہی غیر معمولی ہوگا اور اُسے قدرت نے اخذ و فہم کی خاص صلاحیت عطا کی ہوگی کہ خانساماں یا باورچی کی حیثیت میں مالکوں سے جو کچھ سُنتا رہا، وہ ٹھیک ٹھیک اس کے ذہن نشین ہوتا رہا۔

انگلستان اور فرانس کے سفر میں عظیم اللہ خاں کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسے دیکھ کر عورتیں بے حد متاثر ہوتی تھیں۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جس انگریز گھرانے میں اس نے ملازمت اختیار کی تھی، وہاں بھی کوئی ایسا ہی ذریعہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنے کا باعث بن گیا! ان سوالوں کا جواب قیاسات ہی کی بنا پر دیا جا سکتا ہے، لیکن تاریخ واقعات کا مجموعہ اور حقائق کا ذخیرہ ہے، اس میں قیاسات یا افسانہ طرازیوں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں۔

نانا سے تعلق

انتظام اللہ خاں شہابی فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں ذہین و تیز طبع تھا انگریزی زبان میں مہارت کے متعلق اسے اتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ گورنر کانپور آتے تو ان کے لیے سپاسنامہ عظیم اللہ خاں ہی سے تیار کرایا جاتا۔ اس وجہ سے مقامی حکام میں بھی اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور جب نانا راؤ کو ایک اچھے

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے کئی سال پیشتر بہ مقام لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہتے تھے۔[۵]

تائب فرماتے ہیں:

ہوئے شاہ حضرت کے انعام سے — رہے تھوڑے دن عیش و آرام سے
سفر کی وہاں سے بھی رخصت ملی — پئے جنگ و پیکار اجازت ملی!
چلے کوشش و جستجو کی طرف — گئے بلدۂ لکھنؤ کی طرف

سفر لکھنؤ

لکھنؤ کا سفر اختیار کیا تو مریدین کی ایک جماعت بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھی بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ آپ کانپور میں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے اور کچھ مدت وہاں ٹھہرے رہے۔
۲۔ کانپور سے اناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ گئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔
۳۔ اس زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ ہی میں سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے بھی شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ خدا جانے شاہ صاحب نے کیا کہا کہ مولانا لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر الور چلے گئے۔

تائب نے لکھا:

نصاری سے جو حکم پیکار تھا!
ہر اک شخص سے اس کا اظہار تھا

---

[۱] تحریک ۱۸۵۷ء، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۴۳ مولوی سید امیر علی عنوان گروحی فیض آباد کو ہندوؤں کے قبضے سے چھڑانے میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ اودھ کی حکومت نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا۔ انگریز افسر فوج نے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ یہ ۷، نومبر ۱۸۵۵ء کا واقعہ ہے۔ [۲] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۳ [۳] محراب شاہ قلندر معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و پیکار کی اجازت کا مقصد یہ ہی تھا جس مقصد کے لیے مولوی سید امیر علی شہید ہوئے تھے۔

ایک میومن احمد اللہ کی شہادت اور راجا پوائیں کو پچاس ہزار کے انعام کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:

> برطانیہ کے اس سخت ترین دشمن کا غیر متوقع انجام سر کالن کے تمام جاری جیوش کے مقابلے میں روہیل کھنڈ کے اندر امن قائم کرنے کے لیے زیادہ موثر ثابت ہوا [۱]

مزمدار بالکل بجا کہتا ہے کہ احمد اللہ شاہ تمام تحسینات کا مستحق تھا، تمام لیڈروں میں صرف وہ تھا جس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی اور صرف وہ تھا جسے انگریزی حکومت کے خلاف ذاتی شکایت کوئی نہ تھی [۲] مولانا ابوالکلام آزاد بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند مستثنیات کے سوا سب لوگوں نے ذاتی وجوہ سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیا اور مستثنیات میں سے نہایت ممتاز دو شخص ہیں، ایک احمد اللہ اور دوسرا تانتیا ٹوپے [۳]

آپ نے ملاحظہ فرمایا: امن فوجی قوت کے بل پر قائم نہ ہوا۔ صرف اس وجہ سے قائم ہوا کہ احمد اللہ شاہ کے بعد ملکی قوتوں کو منظم کر کے لڑانے والا کوئی نہ رہا۔

مولانا فضل حق مولانا فضل حق مرحوم خیرآبادی نے بھی مولانا احمد اللہ کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> اس موقع پر متسلط نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لیے ایک اولوالعزم صاحب ہمت کا عامل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا، وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر، رسول طالم

---

۱ MAC MUIN

۲ مزمدار ص ۱۰۰

۳ سر جارج میکن کی کتاب ص ۲۴۰

۴ سین کی کتاب کا پیش لفظ ص ۲۶

اور نبی مرا حم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے
لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلّے میں شکست دے دی[1]

اس کے بعد مولانا فضل حق، شاہ صاحب کی شہادت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انگریز بھاگ کر ایک قصبے کے ہندو زمیندار کے مستحکم حصار میں پناہ گزیں ہوئے اور اپنے اکابر کے پاس پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ چنانچہ مدد آگئی۔ احمد اللہ شاہ سے کافر زمین دار نے داؤ کھیلا۔ قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں یعنی مجاہدین اور انگریز کے درمیان مقابلہ شروع ہوگا تو میں چار ہزار کا لشکر لے کر مجاہدین کی امداد کے لیے آجاؤں گا۔ احمد اللہ شاہ نے اس وعدے پر اعتماد کر کے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ سامنے سے نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ پیچھے سے اس غدار زمیندار نے آتشباری کی۔ اس طرح احمد اللہ شاہ نے شہادت پائی اور ان کی جماعت نے بھی سردار کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔

شہادت کی سابقہ کیفیت کے مقابلے میں یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے، تاہم عام روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ روایت صرف مولانا فضل حق کی ہے۔

مولانا کا حلیہ

میل سن نے احمد اللہ شاہ کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا قد لمبا، جسم دُبلا پتلا لیکن خوب مضبوط تھا آنکھیں بڑی بڑی، بھویں گھنی، ناک کا بانسا اونچا اور جبڑے پتلے تھے[2] مفتی انتظام اللہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سر کے بال کالے تھے اور زلفیں دونوں کاندھوں پر لٹکتی رہتی تھیں[3]

---

[1] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان ص ۲۰۰ [2] میل سن جلد چہارم ص ۲۰۹

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۴۴

جنرل بخت خاں

ابتدائی حالات

جنرل بخت خاں کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اس کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا اور اسے نجیب الدولہ روہیلہ کے خاندان سے قرابت قریبہ تھی۔ اس خاندان پر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں اور پوتے غلام قادر خاں دونوں کے عہد میں گردش کا دَور آیا۔ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کب؛ لیکن ایسے ہی کسی ناسازگار وقت میں خاندان کے افراد بکھرے تو عبداللہ خاں نے اودھ کے ایک ضلع سلطان پور میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ بڑا وجیہ اور خوش رُو تھا اور بہادری میں بھی یگانہ مانا جاتا تھا۔ غالباً انھیں اوصاف کی بنا پر شجاع الدولہ والی اودھ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس طرح پریشانِ روزگار عبداللہ خاں کا رشتہ والیانِ اَودھ کے خاندان سے استوار ہو گیا۔[۱]

بخت خاں کا بیان

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۱ر مارچ ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[۱] حیات علامہ فضل حق خیرآبادی بہ حوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۸۳۶

ہُوا۔ البتہ میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہُوا تھا تو وہ بریلی میں مقیم تھا۔[1]

ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سپاہ میں بے چینی کے آغاز پر توپ خانے کو انگریز اپنی تحویل میں لے لینا چاہتے تھے۔ جس شخص نے رد و کد احتجاجیں کیں اور بڑے بڑے افسروں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں، وہ بخت خاں ہی تھا جو سرکشی کے بعد بریلی کے برگیڈ کا کمان دار بنا اور دہلی پہنچا تو اسے سپہ سالارِ اعظم بنا دیا گیا۔[2]

افکار میں تبدیلی

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کے افکار و عزائم پہلے وہ نہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں ہُوئے مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولوی سرفراز علی کے حکم کی بنا پر انگریزوں سے بیزار ہو گیا۔[3] افسوس کہ مفتی صاحب نے اس کی تفصیل بیان نہ فرمائی، یعنی یہ کہ مولوی سرفراز علی کون تھے؟ بخت خاں نے کہاں ان کی بیعت کی؟ انھوں نے کیا حکم دیا تھا اور کیا کہ کر اُس کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبہ بیدار کیا تھا؟

ہمیں مولوی سرفراز علی کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ ان کا ذکر یقیناً مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسرِ اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہُوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار و مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہُوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہُوا۔[4]

---

[1] میل کن جلد دوم ص ۲۰۲ [2] ایضاً ایضاً ص ۲۰۳

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۔ [4] میل کن جلد سوم ص ۲۰۳

بالکل یہی مضمون حکیم احسن اللہ کے اس بیان میں درج ہے جو بہادر شاہ کے مقدمے میں دیا گیا تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ لکھا، حکیم احسن اللہ خاں کے بیان ہی سے ماخوذ ہے اور حکیم صاحب کا درجہ طبابت یا بعض دوسرے علوم میں کتنا ہی بلند ہوتا، تاہم ان کی دینی معلومات بہت ہی عامیانہ سی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے "وہابی" کا لفظ ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا، جو سید احمد شہید کے مسلک پر کاربند تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی اسلامی سرزمین کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے تو مسلمانوں پر جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے سرگرم داعی تھے۔ اسی لیے حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا کہ بخت خاں خود "وہابی" تھا، جیسا کہ محمد غوث خاں اور مولوی امام خاں "وہابی" تھے۔ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے[۵] اگر سید صاحب سے ان کا تعلق نہ تھا تو کم از کم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ وہ جہاد کو بھی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح اسلام کے ارکان میں سے سمجھتے تھے اور اس پر عمل ضروری جانتے تھے۔ بعض بیانات میں مولوی سرفراز علی کو جونپوری بتایا گیا ہے لیکن ان کے حالات نہیں بتائے گئے۔

بریلی میں پرچم آزادی

بریلی میں بے چینی تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی، جب میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات میں ہنگامے کے آغاز کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ہنگامہ کی ابتدا آتش زنی سے ہوئی۔ مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں، ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں، محمد شفیع اور بخت خاں اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

---

[۵] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۲۹۲

صبح تک پُل سے بریلی کی فوج گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔[۱]

بادشاہ سے ملاقات

۲؍ جولائی کے حالات میں مرقوم ہے کہ نواب احمد قلی خاں فوج بریلی کے استقبال کی غرض سے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں، جنرل صمد خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی تھے۔ احمد قلی خاں اور بخت خاں نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج کو متعین کر دیا جائے۔

بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز لوٹا جائے اس موقع پر فرمایا:

> میرے احکام جاری کرنے سے فائدہ کیا ہو گا؟ ان احکام کی تعمیل ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انھیں نافذ کر سکے میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ میں سپہ سالار کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے نشان مودت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات

---

[۱] دو روزنامچے ص ۱۲۲، ۱۲۱۔ چیو فلس مٹکاف نے اردو روزنامچوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے وقت ناموں کے متعلق متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً یہاں "محمد علی خاں" نام لکھا تھا حالانکہ یہ نواب احمد قلی خاں تھے یعنی زینت محل کے والد اور بہادر شاہ کے خسر۔

قبول فرمالی ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے؛ سب نے بخت خاں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھایا۔

منصب سالاری

پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے داروغہ کو حکم ملا کہ کالا محل[1] بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شہزادہ میرزا مغل سے ملاقات کی:

> محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر اعظم بنا دیا گیا منادی کرادی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایت حاصل کریں۔ میرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کی کوشش کی تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ بادشاہ نے فرمایا:

> تمھیں پورا اختیار ہے۔ جس کام میں بہتری نظر آئے، وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی اگر اب لوٹ مار ہوئی تو تمھیں پھانسی دے دی جائے گی۔[2]

بہادر شاہ کے ایک فرمان سے مترشح ہوتا ہے کہ بخت خاں کو "معزالدولہ" کا خطاب

---

[1] اصل نام "کلاں محل" تھا اور عام لوگ اسے کالا محل کہتے تھے۔

[2] روزنامچے ص ۱۳۲، ۱۳۵

داروغہ پر ایسا ہی الزام لگا اور لوگوں نے اس کی پچاس ہزار کی جائداد لو
لی۔ بخت خاں کو پتہ چلا تو سپاہی اس ظلم کی روک تھام کے لیے بھیج
دیے۔[۱]

۵۔ بہادر شاہ کی ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ نہ
پڑے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر اُس نے شہر میں ذبیحہ گاؤ بند کرایا تھا۔[۲]

۶۔ بخت خاں نے مختلف راجاؤں اور والیانِ ریاست سے بھی خط و کتابت
کا انتظام کیا تھا اور بعض کی عرض داشتیں اسی کے ذریعے سے دربار میں پیش
ہوئی تھیں۔

اختلاف اور رقابتیں

افسوس کہ شہزادوں کو بخت خاں کی یہ کارگزاری اور یہ عزت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُنھوں نے مختلف ذریعوں سے دراندازیاں شروع کر دیں۔ ان کے خاص کارندوں نے شکایتیں کیں کہ ہمیں بخت خاں کی قیادت منظور نہیں اور ہم میرزا مغل ہی کو اس بڑے اعزاز کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ جب تک بخت خاں نہیں آیا تھا، انگریزوں سے روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اور جب سے بخت خاں نے دہلی میں قدم رکھا ہے، لڑائیاں بالکل بند ہو گئی ہیں۔ یہ الزام سراسر غلط تھا، اس لیے کہ ابتدا میں انگریزی فوج بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس ساز و سامان بھی کم تھا۔ اس کے تمام مورچے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد اور ساز و سامان کی مقدار ترقی پذیر رہی۔ یقیناً انگریزوں پر حملہ جتنا آسان ابتدائی دور میں تھا، اتنا آخری دور میں نہیں رہا تھا۔ تاہم لڑائیاں برابر ہوتی رہیں۔

---

[۱] روزنامچے ص ۱۲۶
[۲] ایضاً ص ۱۷۰

منشی جیون لال نے ۱۴ر اگست کے حالات میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کوئی ڈیڑھ سو فوجی افسر بُلائے اور اُن سے کہا کہ میں نے میرزا مغل اور جنرل بخت خاں کو فوجوں کی قیادت کے لیے تجویز کیا ہے۔ تمھیں ان میں جو پسند ہو، اُسے منتخب کرلو۔ ہمارے لشکری ہر وقت بڑ ہانکتے رہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں، لیکن لڑتے نہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ انگریز دہلی لے لیں گے اور مجھے قتل کردیں گے۔ افسر اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہم جانیں لڑادیں گے۔ بخت خاں نے کہا: اب خدا کے فضل سے میں ضرور کامیابی حاصل کروں گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ انگریزوں پر علی پور کی جانب سے حملہ کروں[1]۔ گویا بخت خاں آخری دم تک اس کوشش میں سرگرم رہا کہ جس انگریزی فوج نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس کا تعلق پنجاب، انبالہ اور فیروزپور سے توڑ دیا جائے۔ ۵ر ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ بخت خاں میگزین کو شہر سے باہر لے جانا چاہتا تھا اور اس نے چالیس توپوں کے لیے دمدمے بنانے کا انتظام شروع کر رکھا تھا[2]۔

انتظام جہاد

بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی ایک مرتبہ بعض علماء نے جامع مسجد میں جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ بخت خاں نے تمام علماء کو جمع کرکے کہا کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کردیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ جاری ہوا۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا ہو۔ سرسید نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی فتوے حقیقتاً موجود نہ تھا اور بعض علماء کے دستخط بنا لیے گئے

---

[1] روزنامچے ص ۱۸۱

[2] ایضاً ص ۲۲۲

تھے۔ نیز جن علماء کے دستخط فتوے پر چھپے تھے، ان میں سے بعض نے انگریزوں کی جانیں بچائیں[1]

ممکن ہے یہ رائے درست ہو، لیکن اعلانِ جہاد کے بعد کسی پناہ گیر کی جان بچانا اور اس کی حفاظت کرنا عین واجب ہے، اس میں تضاد کیا ہے؟ جہاد انھیں لوگوں سے ہے جو منظم جنگ کریں، باقی کسی کو چھیڑنا ہرگز جائز نہیں۔

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ایک فتویٰ ضرور تیار ہوا تھا، یہی فتویٰ تھا جس پر دستخط کرنے کے باعث مفتی صدر الدین آزردہ کی جائداد ضبط ہوئی تھی اور انھیں نے "کتبت بالجبر" کو "کتبت بالجبر" قرار دے کر جان بچائی تھی۔ اسی فتوے پر دستخط کرنے کے باعث مولانا فضل حق خیر آبادی پر مقدمہ چلا تھا۔

دہلی سے روانگی

جب انگریز دہلی میں داخل ہو گئے تو عزیمت دوست بخت خاں نے اپنی فوج فراہم کی اور بادشاہ سے بہ منت کہا کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلے چلیں۔ یہ بھی کہا کہ میں دہلی سے باہر تمام سپاہیوں کو اکٹھا کر کے پھر انگریزوں سے لڑوں گا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں لکھنؤ چلا گیا[2]

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ بخت خاں نے آخری دور میں دہلی کے اندر فوج کی کمانداری سنبھالی تھی۔ وہ دیانت کیش انسان تھا اور بڑے خلوص سے فتح حاصل کرنے کی کوششیں کیں، لیکن فوجی لیڈروں نے اسے شکست دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بخت خاں جب لڑائی کے لیے قدم اٹھاتا تو اسے بہت کم یا

---

[1] ایک انگریز عورت کی جان حضرت میاں نذیر حسین مرحوم محدث دہلوی نے بچائی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے دستخط فتوے پر ثبت تھے یا نہیں۔

[2] ذکا و روزنامچے ص ۰۰   [3] سیل من جلد چہارم ص ۵۰

۵۔ ۱۸۷۵ء میں معلوم ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا محمد بے کے ہمراہ جدہ ہو کر مکہ معظمہ چلا گیا ہے۔ یہ اطلاع اس مخبر نے دی جو خود شہزادے سے مل چکا تھا۔

۶۔ جنوری ۱۸۷۵ء میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۷ دسمبر ۱۸۷۷ء کو جوار رحمت الٰہی میں پہنچ گیا۔ گویا مکہ معظمہ کی خاک پاک میں آسودگی پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخر عمر میں ایک آنکھ کی بینائی قریباً زائل ہو چکی تھی اور ایک ٹانگ سے بھی لنگڑانے لگا تھا۔ شریف مکہ نے جو وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اسی میں گزارا کرتا تھا۔

۷۔ شہزادے کی بیوہ نے وظیفے کے لیے حکومت ہند سے درخواست کی تو ۱۸۸۱ء میں اس کے لیے پانچ روپے ماہوار اس شرط پر مقرر ہوئے کہ [illegible] نہ آئے۔ لارڈ رپن کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وظیفہ ایک سو روپے ماہوار کر دیا اور نومبر ۱۸۸۱ء سے پوری رقم ایک سو روپے کے حساب سے یکمشت دلوادی۔[1]

امیر مجاہدین سے ملاقات

اوپر مذکور ہے کہ شہزادہ ۱۸۶۸ء میں سوات آیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سوات نہیں بلکہ یونیز آیا تھا تاکہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے ملے جو اس زمانے میں بہ مقام باج کرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ اپریل ۱۸۶۸ء کا واقعہ ہے۔

کچھ معلوم نہیں کہ شہزادہ اور امیر عبداللہ کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ شہزادہ اس خیال میں ہو گا کہ مجاہدین انگریزوں سے برسر جنگ ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کی تعداد بھی کم ہے اور ساز و سامان بھی معمولی ہے تو وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

عام طور پر مشہور تھا کہ شہزادے کی وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ میرے عزیز دوست

---

[1] سنگھ کی کتاب ص ۲۰۹ - ۲۱۰

مولانا فضل حق خیرآبادی

خاندان

مولانا فضل حق ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے، جن کے علم وفضل اور یگانہ کمالات کے باعث پورے خاندان کی شہرت کو چار چاند لگے۔ مولوی رحمٰن علی مصنّف تذکرہ علمائے ہند انھیں عمری، حنفی، ماتریدی اور چشتی لکھتے ہیں، یعنی مولانا کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، فقہی لحاظ سے وہ حنفی تھے، عقائد میں ماتریدی اور سلسلہ چشتیہ میں انھوں نے بیعت کی تھی۔

ان کے والد مولانا فضل امام کو دہلی میں صدر الصدور کا منصب حاصل تھا۔ والد سے تعلیم پائی۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث پڑھی[۱]۔ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے اساتذہ حدیث میں شاہ عبدالعزیز محدث کا نام گرامی بھی شامل کیا ہے[۲]۔ ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ حافظہ اتنا اچھا تھا کہ چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا[۳]۔

علمی کمالات

ایک روایت ہے، جسے مولانا عبدالشاہد خاں نے قوار کردہ دیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث کی تحفہ اثنا عشریہ شائع ہوئی تو

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴ ۲؎ الثورۃ الہندیہ ص ۲۱ ۳؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴

ایران سے ملا باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کر دی پہلے افق المبین پر اعتراضات کیے، جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد ہوں اور کفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا[1] سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کا یہ حال ہے، وہ خود خدا جانے کیسا ہوگا۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے، ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو افق المبین کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرماتے جاتے تھے[2]۔

درس و تدریس

اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ طالب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دلوایا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا۔ جو غالباً کند ذہن تھا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا، پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستار فضیلت دور جا پڑی، پھر فرمایا:

> تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا۔ ناز نعم میں پرورش پائی۔ جس کے سامنے کتاب رکھی، اس نے خاطرداری

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۲۲، ۲۴۲ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴

مولانا کی زندگی

علم وفضل میں مولانا وقت کے ممتاز ترین اصحاب میں سے تھے لیکن افکار وخیالات یا معتقدات کی بنا پر ان کی حیثیت بہت ہی معمولی تھی۔ زندگی بھی امیرانہ تھی، جسے جفاکشی یا مجاہدے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ دہلی میں میرزا غالب سے گہری دوستی تھی اور میرزا کی پوری زندگی لاابالی تھی۔ امتناع نظیر خاتم النبیین اور امکان نظیر کے بارے میں شاہ اسمٰعیل شہید سے نزاع چھیڑ لی، جو بالکل بے محل تھی۔ اس سلسلے میں مشیت وقدرت کا فرق نظر انداز کر دیا۔ بڑے نازک مزاج تھے شطرنج کا بہت شوق تھا۔ غرض ان کا عام طریقہ وہی تھا، جو اس زمانے کے امراء کا تھا اور کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آرام طلبی، تن آسانی اور امیری کے جنجال سے نکل کر آپ جفاکش مجاہدوں کے حلقے میں پہنچ جائیں گے۔

مولانا اور سیاست

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں مولانا کی ابتدائی زندگی میں کہیں بھی سیاسی امور کی طرف توجہ نہ ہوئی ان کا خاص ذوق یہ تھا کہ جہاں رہیں عزت سے رہیں۔ اچھی تنخواہ ملے، اور آرام واطمینان کی زندگی بسر کریں۔ علم کا ذوق رکھنے والوں کو درس بھی دے دیا کریں اور بس۔ چنانچہ اسی اسلوب ونہج پر ان کی زندگی گزر گئی۔ غالباً آخری دور میں بعض دوسرے حساس ودیدہ ور اصحاب کی طرح ان پر بھی انگریزی تسلط کی خرابیاں منکشف ہوئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت میں تکدر پیدا ہوا، جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔

محرکات مخالفت

مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، انھیں یہاں خلاصۃً درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ انھیں نہ کبھی میدانِ جنگ سے واسطہ پڑا تھا، نہ وہ فنونِ حرب سے آگاہ تھے۔ بازاری لوگوں کو انھوں نے اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا تھا۔

۵۔ انگریزوں کا مقابلہ کرنے والوں میں بعض بے سردار تھے اور بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر لی تھی۔

صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

ظاہر ہے کہ ان تاثرات کے بعد مولانا یہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے کہ نتیجہ حسبِ مراد نکلے گا! لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بحث نتیجے سے نہ تھی، صرف یہ مطلوب تھا کہ جو کچھ ہو سکتا ہے اس میں توقف نہ ہونا چاہیے۔

فتویٰ

مولانا کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علماء دہلی سے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھیں نے علماء کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔ اسی فتوے پر مفتی صدر الدین آزردہ کے دستخط تھے، جن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک لطیف تعبیر کی گئی اور مفتی صاحب الزامِ شرکت سے بری ہوئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا، ورنہ انھوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔

دہلی سے روانگی

۱۹ ستمبر کو شہر دہلی فتح ہوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ روز بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے پھر اہل و عیال کو ساتھ لے کر رات کے وقت چھپ چھپا کر نکلے اور بہت مشقتوں کے بعد بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے جو نواب صدر یار جنگ بہادر کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور کے ساگرہ کے

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں

تمہید

ان دونوں بزرگوں کے حالات یک جا بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آزادی کے جہاد میں ان دونوں نے اکٹھے کام کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل ایک مذہبی جہاد میں یہ رفیق تھے، دوسرے جنگِ آزادی ناکامی پر منتج ہوئی تو دونوں یکے بعد دیگرے حجاز پہنچ گئے اور باقی زندگی اسی مقدس سرزمین میں پوری کرکے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دونوں کے زیادہ تر حالات اسی دور کے متعلق ملتے ہیں جب اُنھوں نے اکٹھے کام کیا۔

مولانا رحمت اللہ

مولانا کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، اس لیے کیرانوی مشہور ہو گئے۔ والد کا نام مولوی نجیب اللہ، اجداد کا اصل وطن پانی پت تھا جہاں ان کی خاصی جائداد بھی تھی۔ یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جدِ اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمٰن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے اخلاف میں سے ایک صاحب مولانا محمد عارف الاسلام، مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کو اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ پھر دہلی چلے گئے، جو اس زمانے میں علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درس گاہیں قائم

پہلے کلکتہ کے ہسپتال میں متعین ہوئے۔ پھر انھیں آگرہ بھیج دیا گیا۔ وہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاج گنج کے محلہ کاغذیاں میں رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں "اکبرآبادی" لکھا گیا۔

یکساں ذوق اور دوستی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی کے علمی اور عملی ذوق میں یکسانی کے کئی پہلو تھے۔ مثلاً دونوں آزادیِ وطن کے شیدائی تھے۔ حسب موقع دونوں نے جنگ میں سرگرم حصہ لیا۔ دونوں کو عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور پادریوں کے ساتھ مناظروں میں ان کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ اس وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلغ ہندوستان پہنچ گئے اور انھوں نے جگہ جگہ مشن قائم کر لیے۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کر لیے گئے تھے جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بہ کثرت چھاپ چھاپ کر نشر کی جاتی تھیں، اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف حصص ملک کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر

۱۸۵۴ء میں یورپ سے فنڈر نام ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور وہ اکثر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلاواسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے۔ تورات، زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی۔ اور نہ

عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں، جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں، پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچا لیا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ کو کیرانہ سے بلوایا وہ دراصل فنڈر کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں ٹھہرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ

۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ (۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء) کو آگرہ میں مناظرے کا انتظام ہوا۔ چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا، اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں سے علماء، امراء اور عام لوگ آگرہ پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس تھے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اوّل پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ، مسلمانوں کی طرف سے مناظر اوّل مولانا رحمت اللہ کیرانوی[1] اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولانا فیض احمد بدایونی بھی اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے معاون تھے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا مسلمان اثبات رسالت صلعم اور محفوظیت قرآن کے دلائل دیں نیز تثلیث کا ابطال کریں اور ثبوت دیں کہ انجیل و تورات محرف ہیں۔ عیسائیوں کا موقف اس کی ضد تھا۔

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں،

پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا آگرہ گئے تو ترجمل اینسٹ میں قیام پذیر ہوئے تھے (مشاہیر جنگ آزادی ص ۱۰۲)

بحث وتمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان
کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں، لیکن صرف
مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب
کو خود مشکوک مان رہا ہے، اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو
سکتے ہیں۔ الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے
اُٹھنا پڑا اور آگرہ سے چلتا بنا۔[1]

غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سینکڑوں، ہزاروں، مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے گہری واقفیت حاصل کر لی اور عیسائیوں یا دوسرے مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگِ آزادی

میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی، بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ نواح کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدینؒ

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۳۱۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے انجیل و تورات کے کثیر تعداد نسخے کھول کر رکھ دیے تھے۔ اور ہر نسخے کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر اختلاف کے ثبوت دیتے جاتے تھے، اس کیفیت پر سب حیران رہ گئے، پھر فنڈر اور مولانا میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ خط و کتابت امین الدین ہندی نے چھاپ دی تھی، مناظرہ کی روداد سید عبداللہ اکبرآبادی نے شائع کی (مشاہیر جنگ آزادی ص ۱۴۳)

[2] معلوم ہوا کہ چودھری صاحب بھی مولانا کے پاس حجاز چلے گئے تھے۔

بغیر آتی تھیں، انھیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے:

مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد
کی صورت کیا ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے، عیسائی
مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس
مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔ اس دانشمند مولوی کے
نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک
ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلے گئے[1]

غور طلب حقائق

ظاہر ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہوگا جب دہلی میں مجاہدین کی خاص تعداد مقیم تھی اور مقابلہ ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ مولانا، نے اپنے ہاں جہاد کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ دہلی کے مرکز کی حالت دیکھیں، اُسے ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچائیں یا باہم مشورے سے تنظیمات کا بندوبست کریں، ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ علمائے کرام کے نزدیک یہ ہنگامہ نہ جہاد تھا اور نہ اسے وہ نتیجہ خیز قرار دے سکتے تھے۔ وہ صحیح اصول و ضوابط کے مطابق انگریزوں سے لڑ کر اُنھیں نکالنا چاہتے تھے۔ یہ غرض نہ تھی کہ بے وجہ قتل و غارت کا طوفان اٹھا دیں۔

ہجرت

مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے اُنھیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے لیے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور

---

[1] ذکاء اللہ صفحہ ۶۷۔ یہ بیان درست ہے تو یقیناً اس سے مولانا رحمت اللہ کی بالغ نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ سمجھ چکے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے مقاصد و آداب جہاد سے کوئی مناسبت نہیں، بعض دوسرے بالغ نظر لوگوں کا احساس بھی یہی تھا، لیکن جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا، غالباً ان کی رائے یہ تھی کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنا مناسب نہ ہوگا اور اصلاح بہر حال سعی و ہمت ہی کی متقاضی ہے۔

بزرگانِ دیوبند

پہلا درجہ بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اوّلین درجہ احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ، حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رُخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عمل نمونے چھوڑ گئے۔ جو دلوں اور رُوحوں میں دینِ حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار ——— دار العلوم دیوبند ——— ایسی ہے جو قریباً ایک صدی سے پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں دائروں میں قابلِ فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصّہ لیا تھا، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی، وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا، اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا بیان

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اس میں سے قاضی سعادت علی خاں پسر قاضی نجابت علی خاں کے دو فرزند تھے، ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا، چھوٹا بھائی اطمینان سے امیرانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں میں باہم بے حد محبت تھی، گویا ایک دوسرے کے جاں نثار اور عاشق زار تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں ایک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خاں چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارن پور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا، ایک بنیے کو بیچارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی۔ اس نے سپنکی[۱] صاحب کے پاس رپورٹ کر دی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے اور کئی روز سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خون ناحق

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ذی الحس انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی خاص ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے[۲]

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

---

[۱] SPANKIE صحیح نام ہے سہارن پور کا سول افسر تھا۔ مولانا عاشق الٰہی نے اسے سپنکی لکھا ہے

[۲] تذکرۃ الرشید حصہ اول صـ ۷۴

کی پریشانی میں گھر بار اور زندگی تباہ کر ڈالی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں، دُنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چنانچہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ چونکہ حکومت کے فیصلوں اور شرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی، اِس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔[۱]

ایک واقعہ مولانا عاشق علی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب، مولانا قاسم اور حافظ ضامن کا ایک مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

> یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے، وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[۲]

---

[۱] تذکرۃ الرشید حصۂ اول صـ۷۴ [۲] ایضاً صـ۷۵

مبادا "سرکار کے باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کی طرف دار ہو کر آئے تھے۔ پھر "سرکار" کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ بظاہر اس سے حکومت مراد لی جا سکتی ہے۔ کتاب "تذکرۃ الرشید" ایسے زمانے اور ایسے حالات میں مرتب ہوئی تھی جب انگریزوں کا اقتدار اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیشِ نظر کیا بات تھی!

حافظ محمد ضامن

حافظ محمد ضامن، جو میرے اندازے کے مطابق انگریزی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے تھانہ بھون کے باشندے اور حضرت حاجی صاحب کے خواجہ تاش یا پیر بھائی تھے، یعنی دونوں بزرگ حضرت میاں جی نور محمدؒ جھنجھانوی کے مُرید تھے۔ حافظ صاحب کے کمالات کا اندازہ بعض روایات سے ہو سکتا ہے، مثلاً:

۱۔ جب کوئی شخص اِن کے پاس آتا تو فرماتے، بھائی اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو (مولوی شیخ محمد کی طرف اشارہ کر کے کہتے) مولوی صاحب سے پوچھ لے، اگر تجھے مرید ہونا ہے تو وُہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب، ان سے مرید ہو جا۔ اگر حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔[۱]

۲۔ اپنے مرشدِ طریقت حضرت میاں جیؒ صاحب کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے۔ حافظ ضامن صاحب کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ ڈالیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا:

---

[۱] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۵۲

رشتے کی پروا نہیں، لیکن میں جس طرح سمجھا ہوا جاتا ہوں، اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں، اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا[1]

میل سن کا پیش کردہ نقشہ

اب آپ میل سن کا پیش کردہ نقشہ سامنے رکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شاملی کے ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ بپا کیا تھا اور دربار دہلی سے تعلقات مکاتبت پیدا کر لیے تھے۔ انگریز اُسے دبا نہ سکتے تھے، البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ پھر سپینکی صاحب نے گورکھوں کا ایک جیش بھیج دیا اور ایڈورڈز نے اس کمک سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنے ایک وفادار مسلمان ماتحت ابراہیم خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ شاملی میں چھوڑا اور ایڈورڈز خود بڑھانا چلا گیا۔ یہ ۱۴ر ستمبر کا واقعہ ہے۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر قاضی عنایت علی خاں نے اپنے جانباز جوان ساتھ لیے اور شاملی پر ہلّہ بول دیا۔ ابراہیم خاں نے مقابلہ کیا، لیکن آخر وہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔ میل سن لکھتا ہے کہ ابراہیم خاں کے ساتھ عہد ہُوا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی عزت و جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، لیکن حوالگی کے بعد ایک سو سترہ آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا[2]

بعد کے حالات

ایڈورڈز لوٹا تو اُسے بڑا غصہ آیا، لیکن مظفر نگر سے تشویشناک خبریں ملیں تو اُدھر چلا گیا۔ بعد ازاں ایک جیش تھانہ بھون بھیجا گیا جو سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھا۔ کپتان سمتھ اور لفٹنٹ کیو اس کے کماندار تھے۔ چونکہ اس جیش کی تعداد کم تھی، اس لیے مجاہدین نے اُسے مار بھگایا۔ مزید چند روز گزر گئے تو ڈنلاپ آیا۔ تھانہ بھون پر قبضے کے بعد وہ شاملی پہنچا اور وہاں بھی انگریزی حکومت بحال کر دی۔

---

[1] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۵۶ [2] میل سن جلد ششم ص ۱۲۴

میرا اندازہ ہے کہ حافظ محمد ضامن کپتان سمتھ اور لفٹننٹ کیورلر کے مقابلے میں شہید ہوئے جس افسر کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے شاملی کی ویرانی دیکھ کر غصہ آیا، وہ ایڈورڈز تھا۔ ڈیپو کے حملے کے بعد سب کو منتشر ہونا پڑا۔

حاجی صاحب اور مولانا قاسم

انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد حضرت حاجی صاحب نے چند مہینے انبالہ، تگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضعات و قصبات میں چھپ چھپا کر گزارے، پھر سندھ اور کراچی کے راستے عرب تشریف لے گئے۔ روانگی سے پیشتر گنگوہ بھی پہنچے تھے تاکہ مولانا رشید احمد سے ملاقات کریں اور وہاں راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل میں قیام کیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد باقی عمر مبارک وہیں گزار دی۔ مولانا محمد قاسم کے بھی وارنٹ جاری ہوئے تھے، وہ کچھ مدت گرفتار نہ ہوئے۔ پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مولانا رشید احمد

مولانا رشید احمد تھوڑی دیر چھپے رہے۔ گنگوہ میں پولیس پہنچی تو مولانا کے چچیرے بھائی مولوی ابوالنصر کو گرفتار کر لیا اور یہ سمجھ کر بہت تکلیفیں دیں کہ یہی مولانا رشید احمد ہیں۔ جب غلط فہمی آشکارا ہوئی تو ایک اور مخبر کی اطلاع پر پولیس رام پور گئی اور وہاں سے مولانا کو گرفتار کر کے سہارن پور لے گئی۔ یہ ۱۲۷۵ھ کے اواخر یا ۱۲۷۶ھ کے اوائل کا واقعہ ہے، یعنی وسط ۱۸۵۹ء کا۔ مولانا کی [illegible] یہ زمانہ بے مثال صبر سے گزارا۔ ان کے والد مولوی محمد تقی کچھ ہی دن پیشتر نواب جھجر کی ملازمت میں شہید ہو چکے تھے۔ پھر یکایک یہ مصیبت نازل ہو گئی۔

مقدمہ

مولانا نے تین چار دن کال کوٹھڑی میں گزارے اور پندرہ دن حوالات میں رہے۔ مقدمہ پیش ہوا تو حکم ہو گیا کہ انھیں مظفر نگر لے جانا چاہیے۔ قریباً چھ ماہ بعد انھیں رہائی ملی۔

میل کن لکھتا ہے کہ تھانہ بھون کے واقعے کے بعد جو گرفتاریاں ہوئیں، ان کے متعلق

پیل نے حکم دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انھیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکاب جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ مولانا کے خلاف ایسے اثبات کا کوئی بھی امکان نہ تھا، لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے۔

"تذکرۃ الرشید" میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے۔ جنھوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی۔ یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی، غلام علی ساکن قصبہ علی پور اور حکیم احمد امیر بخش رام پوری۔

[illegible]

[illegible]

بات ہے بے گناہ انسانوں کو پھانسیاں دیں [illegible]

چھوڑ دیا [illegible] صاحب ان کو جنگ آزادی میں حصہ لینے

والوں میں شمار کیا۔ اور انگریز حکومت نے ان لوگوں کو [illegible]

کیا انگریز کو جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں [illegible]

ہوتا کہ [illegible] نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تو [illegible] اور

قید کی سزا دیتے۔

جیسے [illegible]

[illegible] نے [illegible] کیا کہ انگریزوں کو [illegible] دینے

والوں کو جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں میں شمار کرتے ہیں

اور پھر بھی انگریز نے ان لوگوں کو [illegible] کیا

ان سے جو اعلیٰ ملبوسات تقسیم کے لیے گئے تھے، ان میں سے ایک بیش قیمت لباس بر کمال امرار نواب کی نذر کیا[1]

پھر شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ انتظام نواب صدیق حسین خاں ہی کی تحریک پر ہوا۔ معمول یہ تھا کہ نواب ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا۔

۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور مکہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہے۔

نواب سخاوت حسین

معاملہ نواب تفضل حسین پر ختم نہ ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو بھی ۱۸۵۷ء ہی کے واقعات کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی۔ منیر شکوہ آبادی نے اس حادثۂ الیمہ کی تاریخ کہی :

---

[1] "تاثر صدیق" یعنی نواب صدیق حسن مرحوم کے سوانح جو ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں نے مرتب فرمائے حصہ دوم ص ۷۰، ۷۱

نواب علی حسن خاں نے خدا جانے کس وجہ سے اس واقعے کو نواب تجمل حسین خاں سے منسوب کر دیا حالانکہ وہ ۱۸۳۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ یہ واقعہ نواب تفضل حسین خاں کا تھا جو شاید جنگ آزادی کے فاضل مولف نے معلوم نہیں کیوں اس واقعے میں بے اصل مبالغہ ضروری تصور فرمایا یعنی لکھا کہ نواب صدیق حسن خاں مکہ معظمہ پہنچے تو نواب تفضل حسین خاں بھی فقرا کی صف میں کھڑے ہوئے تھے اور شل گداگروں کے مستحق امداد تھے۔ نواب صدیق حسن یہ حال دیکھ کر رو پڑے تفضل حسین کو اپنی قیام گاہ پر لائے اور ایک نیا جوڑا بنا کر دیا (ص ۲۲۰)

تاثر صدیق میں کہیں یہ تفصیل مندرج نہیں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں خود ان سے جا کر ملے اور ایک بیش قیمت پوشاک بر کمال امرار ان کی نذر کی۔ بلاشبہ تفضل حسین خاں شکستہ حال و مفلس تھے۔ لیکن ان کی غیرت کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ فقیروں کی صف میں کھڑے ہو کر مستحق امداد ہوں۔

غازیوں کی ترکتاز

خان بہادر خان کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اُٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، تلوار نہ چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے۔ عین اس موقع پر اس جیش نے حملہ کیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ لوگ بڑے وجیہ تھے۔ جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ ڈاڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سبز رنگ کی پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمر بند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات منقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملہ کے لیے آئے۔ سر نیچے کر رکھے تھے اور انھیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا، تلواریں بلند تھیں۔ "دین" "دین" پکار رہے تھے[1] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ سکھ اس سیل کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی ہماگرا پلٹن پر جا گرے۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدان جنگ ہی میں جانیں دے دیں۔ تین غازی بریگیڈیر کیمرون[2] پر جا گرے اور اُسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح بریگیڈیر وال پول کی جان بڑی مشکل سے بچی[3]۔

ایک اور چال

اب بظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا، لیکن یکایک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا۔ کیوں!

---

[1] انگریز مورخوں نے بار بار "دین" "دین" کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ عموماً تکبیر کہتے تھے۔ بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰ کی دلاوری کے جوشِ اتباع میں "یا علی" بھی پکارتے تھے۔

[2] CAMERON

[3] میلی سن جلد چہارم ص ۳۶۸، ۳۶۹

اسی وجہ سے کہ غازیوں کی ترکتاز سے فائدہ اٹھاکر خان بہادر خاں کے رسالے نے انگریزی فوج کے بسرے کا چکر کاٹا اور وہ فوج کے عقب میں پہنچ گیا تاکہ انگریزوں کا کیمپ اور ساز و سامان لوٹ لے۔ اس سے کیمپ میں شدید خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور ہر شخص سراسیمہ وار ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس اثنا میں غازیوں کے ایک اور مختلف جیش نے حملہ کر دیا اور وہ سب بھی شہادت پا گئے۔

غرض اس جواں مردانہ مقابلے نے کالن کیمبل کو رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ادھر تاریکی کا دور دورہ شروع ہوا، ادھر خان بہادر خاں بریلی سے نکل کر پیلی بھیت چلا گیا جو پینتیس میل شمال مشرق میں تھا۔

آخری دور مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوائیں کو غداری اور بدعہدی کی عبرت ناک سزا دیں۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں، نواب تفضل حسین خاں، ولایت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے، وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔[۱]

۱۸۶۰ء میں کوہستان نیپال کے دامن کی ایک لڑائی میں خان بہادر خاں گھوڑے سے اتفاقیہ گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ انگریز اُسے لکھنؤ لائے۔ چیف کمشنر کے روبرو پیش ہوا تو زمین پر بیٹھ گیا۔ کرسی پیش کی گئی تو فرمایا: مدتوں کرسی پر بیٹھے اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے۔ چیف کمشنر نے اُسے بزور کرسی پر بٹھایا۔

بیان جب پرسش شروع ہوئی تو بڑی مردانگی سے فرمایا:

---

[۱] میلی سن جلد پنجم ص ۱۹۱، ۱۹۲

میں نے از خود بغاوت پر کمر نہیں باندھی۔ سرکارِ انگریزی میں فوج باغی ہو گئی اور جس ملک کا جو دعوے دار تھا، اس کا رئیس گردانا گیا۔ بریلی، شاہ جہان پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی کل روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے بلوا نہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا تب میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے اختیار میں نہ تھی، اُنھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعد ازاں لڑائیاں جا بجا سر میدان میری اور آپ کی فوج کی البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا۔ اس میں میری کیا خطا؟

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند!

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہیے میری نسبت حکم دیجیے[1]

تبصرہ خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا۔ اس کے جواب میں اس نے جو کلمات عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا تھا وہ یقینی اور قطعی طور پر درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا، نہ کسی انگریز افسر کو بہ طور خود سزائے موت دی۔ سپاہ تمام اُمور میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی لیکن انگریزوں

---

[1] تاریخ سلیمانی بحوالہ حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۶۳، ۲۶۴

کے قتل کے متعلق کسی کا حکم نافذ ہی مانا گیا، کیوں ؟ اس لیے کہ اوّل سپاہ کو انگریزوں کے غلط اور بے پناہ طرز عمل کے باعث سخت غصہ تھا۔ دوم انگریز جہاں جہاں کامیاب ہوتے رہے، اس ملک کے باشندوں پر نہایت خوفناک اور ہول انگیز ظلم کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اہل ملک کے سینے انتقام کے جذبات سے بے طرح بھر جاتے اور انھیں انگریزوں کے خلاف کسی بھی کارروائی سے روکنا ممکن نہ رہتا۔ یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں ایسے افعال قتل کے لیے معذرت نہ سمجھا جائے۔ غلط فعل بہرحال غلط ہوتا ہے خواہ اسباب کچھ ہوں تاہم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ جن حالات میں واقعات قتل پیش آئے وہ سراسر غیر معمولی تھے اور اس ضمن میں غیر معمولی اشتعال خود انگریزوں نے پیدا کر دیا تھا۔ خان بہادر خاں نے جہاں یہ کہا تھا کہ مجھے کسی واقعہ قتل سے کوئی تعلق نہیں، وہاں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر میں مجرم ہوتا تو اپنے آپ کو حوالے کیوں کرتا ؟

پھانسی

خان بہادر خاں کے لیے پھانسی کی سزا غالباً پہلے سے تجویز ہو چکی تھی۔ پھر انگریزوں کی شقاوت اور سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ یہ سزا لکھنؤ میں نہ دی بلکہ خان بہادر خاں کو بریلی لے گئے اور وہاں کوتوالی کے سامنے پھانسی پر لٹکایا۔

آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کر دیجیے۔ فرمایا مجھے کچھ نہیں کہنا۔ پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا :

به جرم کلمہ حق می کشند غوغائیست
ز مرگ زندگیم مے شود تماشائیست

چونکہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے شورش ہو جائے، اس لیے انگریزی فوج اور توپ خانے سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

سلہ حیات حافظ رحمت اللہ خاں ص ۳۶۳

تاہم یہ پھر چپ چاپ اُٹھے اور حضرت محل کی قیام گاہ سے قریب ایک گھاٹی میں جا ٹھہرے
پھر رہا جنگ بہادر کے بھائی نے اُنھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ خود جنگ بہادر آیا تو ممو خاں
سے پوچھا کہ آیا کسی میم یا صاحب کو اپنے ہاتھ سے بھی مارا ہے؟ ممو خاں نے نفی میں جواب دیا
جنگ بہادر نے کہا کہ پھر مطمئن رہیے۔ اس اثنا میں ایک انگریز افسر آیا اور جنگ بہادر کی اجازت
سے ممو خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ لے گیا۔

بتاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ بروز دوشنبہ (۱۰ دسمبر ۱۸۵۹ء) ممو خاں جیل خانے
میں داخل ہوا۔ شیخ لکھمن رسالدار بھی ساتھ ہی گرفتار ہوا تھا۔[1] گویا ممو خاں نے حضرت محل
کے داخلِ نیپال کے بعد قریباً ایک سال نیپال یا اس کے حوالی میں گزارا۔

مقدمہ اور سزا

مقدمہ پیش ہوا تو ممو خاں نے بڑے اچھے جوابات دیے۔ بہت
سی چٹھیاں بھی دکھائیں جن سے واضح ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کا
بدخواہ نہ تھا۔ پھر اسے جیل خانے سے نکال کر فرح بخش کے ایک کمرے میں رکھا گیا۔ خرچ
کے لیے کچھ روپیہ مقرر ہو گیا اور خدمت گار بھی ساتھ رہنے لگے۔ کئی مہینے کی پیشیوں کے
بعد پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ جارج کیمبل کے پاس اپیل ہوئی تو اس نے موت کی سزا کو انڈیمان
میں قیدی کی سزا سے تبدیل کر دیا۔ چنانچہ ممو خاں کو انڈیمان بھیجا گیا۔ راستے میں جہاز سے اتر کر
بھاگا مگر پکڑا گیا اس وجہ سے اس کی سزا حبسِ دوام کی شکل اختیار کر گئی۔[2]

آخری دَور

مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶۵ء میں انڈیمان پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں
کہ جس زمانے میں کرنیل فورڈ انڈیمان کا سپرنٹنڈنٹ تھا:

> پچاس نفر قیدیان بغاوت واسطے مدد راجا بروکس صاحب
> کے ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء کو جزیرہ سراک بھیجے گئے کہ ان میں نواب
> ممو خاں نائب بیگم صاحبہ والدۂ برجیس قدر بھی تھے کہ سراک میں

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۶۰ [2] ایضاً صفحہ ۳۶۰

جا کر فوت ہو گئے[۱]

گویا نواب ممّن خاں کی حیات اسیری کے قریباً پانچ سال انڈیمان میں بسر ہوئے، پھر وہ سراوک چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

جیمی گرین | اصل نام محمد علی خاں تھا کہتے ہیں کہ نواب نجیب الدولہ مرحوم کا پوتا تھا بریلی میں تعلیم پائی۔ رڑکی سے انجینیری کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ امتحان میں انگریزوں سے بھی زیادہ نمبر حاصل کیے تھے مگر ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ملازمت بہت معمولی ملی پھر ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو انجینیری میں معمولی حیثیت کا مالک تھا آخر استعفیٰ دے کر جیمی گرین اودھ پہنچا۔ اس زمانے میں نیپال کا مختار جنگ بہادر ولایت جا رہا تھا، اسے ایک انگریزی داں سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ محمد علی خاں کو انگریزی میں خاص کمال حاصل تھا چنانچہ مہاراجا کے ساتھ ولایت گیا۔ دوبارہ عظیم اللہ خاں کے وفد میں شریک ہو کر ولایت کا سفر اختیار کیا کہ نانا نے پنشن کے سلسلے میں بھیجا تھا عظیم اللہ خاں کے ساتھ طلب علم کے زمانے سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔

۱۸۵۷ء میں جیمی گرین لکھنؤ پہنچا اور وہاں حضرت محل کی حکومت میں چیف انجینئر مقرر ہوا۔ انگریزی فوج کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر کانپور گیا۔ فوج میں پھیری کرتا ہوا گرفتار ہوا اور جاسوسی کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی[۲] وہ عموماً اصل نام (محمد علی خاں) سے نہیں بلکہ اختیار کردہ نام جیمی گرین سے مشہور رہے۔

---

[۱] تاریخ عجیب ص ۲۹۴۔ ۳۴۴

[۲] ماخوذ از "العلم" "جنگ آزادی" نمبر

گرفتاریاں اور سزائیں

چوتھی اور پانچویں جولائی کو تلاشیاں شروع ہوئیں ہنگامے کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے جائیں۔

اکتیس آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں پیر علی خاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ شیخ گھسیٹا گرفتار ہوا جو پٹنہ شہر کے سب سے بڑے سیٹھ لطف علی خاں کا ملازم تھا۔ اکتیس آدمیوں میں سے چودہ مجرم قرار پائے اور انہیں بے تامل موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں وارث علی بھی تھا جو پولیس میں عہدیدار تھا اور اسے ترہٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگوں کو قید اور تازیانے کی سزائیں دی گئیں۔ جب ٹیلر کو پٹنہ سے بدلا گیا تو اس کے جانشین نے صرف قید اور تازیانے کی سزائیں پانے والوں کے کاغذات نظامت عدالت میں بھیجے۔ غور و فکر کے بعد فیصلہ ہوا کہ گواہوں کے بیانات سزاؤں کے لیے ہرگز کافی نہ تھے۔ اصل میں ٹیلر نے اندھا دھند سب کو من مانی سزائیں دلا دی تھیں۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ جرم اور عدالتی آداب کے تکلفات ملحوظ نہ رکھے گئے۔ اگر رکھے جاتے تو پٹنہ کے سیروں کا حشر خدا جانے کیا ہوتا۔ ٹیلر جن اکتیس قیدیوں کو موت کی سزا نہ دلا سکا تھا، ان سب کو نظامتِ عدالت نے رہا کر دیا۔

گویا پٹنہ میں اندھا دھند تعزیر و سزا کا سلسلہ ٹیلر نے شروع کیا تھا جو کمشنر تھا اور جس کے پیشِ نظر "سیروں" کی حفاظت تھی۔ یہی ٹیلر تھا جس نے ۱۸۶۵ء میں ان مجاہد مسلمانوں کو خوفناک سزائیں دلوائیں جو ہمارے ہاں "وہابی" مشہور ہوئے۔

میل سن لکھتا ہے کہ وارث علی کو پھانسی دینے کے لیے لے جا رہے تھے تو اس نے پکار کر کہا کہ اگر کوئی شخص شاہِ دہلی کی دوستی کا دم بھرنے والا موجود ہو تو سامنے آئے اور مجھے چھڑائے۔[1]

---

[1] میل سن جلد سوم ص ۳۰

حج کے لیے گیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں بہ مقام مکہ معظمہ وفات پائی۔ البتہ حکیم سراج الحق کی صاحبزادی سے سلسلہ چلا۔ ان کے صاحبزادے ظہور الحق کراچی میں ہیں۔ حکیم سراج الحق نے آخر میں حکیم انتظار الحق کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا تھا۔ وہ بڑے نامی طبیب ہوئے لکھنؤ میں مطب کرتے رہے۔ پھر الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں وفات پائی۔

تصانیف

اگرچہ مولانا فیض احمد کو اطمینان سے علمی کام جاری رکھنے کا موقع نہ ملا، لیکن ان کی کئی تصانیف کا ذکر ہوا۔ مثلاً رسالہ تعلیم الجاہل جو شاہ اسحاق دہلوی کے رسالے تفہیم المسائل کے جواب میں تھا۔ حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت، فصوص الحکم فارابی پر تعلیقات۔ مجموعہ نثر و قصائد عربیہ موسوم بہ ہدیہ قادریہ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ نقرے اور ایک ہزار ایک سو گیارہ شعر ہیں۔[لہ]

مولانا کفایت علی کافی

مولانا کفایت علی کافی کا اصل وطن مرادآباد تھا۔ جہاں ۹ ار مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگامے کی ابتدا ہوئی تھی اور جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ سید گلزار علی ساکن امروہہ مرادآباد کی عدالتوں میں مختار تھے۔ وہ پہلے امروہہ پہنچے ایک عرضداشت دہلی بھیجی، پھر اودھ چلے گئے۔ روپوش رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

دوسرے مجاہدوں کے علاوہ مولانا کفایت علی کافی نے بھی جہاد آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ سرجان کراکر ولسن وہاں کا کمشنر تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اسے عوام میں وسیع رسوخ حاصل ہے۔ بایں ہمہ ۲ ر جون کو حالات بگڑے۔ ولسن نے پھر پھرا کر اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں

لہ زیادہ تر حالات محمد ایوب صاحب قادری کی مختصر سی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ جس کا نام ہے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد" مولانا فیض احمد بدایونی۔ جابجا اس کے حوالے نہیں دے سکا۔

ک JOHN CRACROFT WILSON

لارڈ کیننگ نے بعد میں لکھا کہ دیوانی کے کسی افسر نے ولسن کے برابر مسیحیوں کی جانیں بچائیں۔[1] بعد میں وہ نیوزی لینڈ جا بسا تھا اور وہاں ایوان کے نمائندگان کا ممبر بنا رہا۔ ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ مولانا کفایت علی کی سرگرمیوں کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ مرادآباد میں انھیں صدر الصدور بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شرعی احکام جاری کیے۔ آنولہ (ضلع بریلی) بھی گئے اور وہاں حکیم سعید اللہ کے پاس ٹھہرے۔ اس اثنا میں نشر و تبلیغ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جان بچ گئی۔ کچھ معلوم نہیں کب وفات پائی۔ ایک بیان مظہر ہے کہ ان کی قبر سڑک میں آگئی تھی۔ مولوی محمد عمر نعیمی مرادآباد کے نانا شیخ برکت علی نے ان کی میت نکلوا کر جیل کے عقب میں دفن کرائی۔[3]

عبدالغفور خاں نساخ نے "سخن شعر" مرتب کی تھی تو مولانا زندہ تھے۔ چنانچہ نساخ لکھتے ہیں:

> صاحب علم و فضل و زہد و ورع ہیں بیشتر اشعار ان کے حمد و نعت میں ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی حضرت مولانا کافی کی نعتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ وہ سلطان نعت ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "بہار خلد" بتائی گئی ہے یعنی ترمذی کا منظوم ترجمہ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲ر صفر ۱۲۵۷ھ (۱۵ر اپریل ۱۸۴۱ء) کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ ۱۲۰۹ھ میں دوسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔

مولانا کو طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے طب کی تعلیم مولوی رحمان علی صاحب

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی بک لینڈ [2] مشاہیر جنگ آزادی ص ۳۱، ۳۲

[3] مشاہیر جنگ آزادی ص ۳۲

۲۔ عبداللطیف خاں کا چچا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

۳۔ اسماعیل خاں جسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۴۔ مہدی بخش، اسے بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۵۔ قاضی وزیر علی کی جائداد ضبط کر لی گئی، اس لیے کہ اس نے منصب قضا کا کام انجام دیا تھا۔

رفیقوں میں ایک لچھمن سنگھ کا نام بھی آیا ہے۔ غرض جائدادیں سب کی ضبط ہوئیں۔ مارگڑھ کا قلعہ بارود سے اڑا دیا گیا اور اس سلسلے میں ایک انگریز افسر اور کچھ سپاہی بھی مارے گئے ولی داد خاں کی جائداد بھی ضبط ہو گئی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی عنایت احمد، بن منشی محمد بخش، بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ۔ ان کی ولادت بہ مقام دیوہ ۹ شوال ۱۲۲۸ھ (۵ اکتوبر ۱۸۱۳ء) کو ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے پہلے رام پور گئے، جہاں مولوی سید محمد علی رام پوری اور مولوی سید حیدر علی سے پڑھتے رہے۔ پھر دہلی جا کر شاہ اسحاق سے حدیث کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ کر سند حاصل کر لی۔ بعد ازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی سے معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ ایک سال تک مولانا بزرگ علی کے مدرسے میں مدرس رہے پھر منصف اور مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بہ حیثیت صدر امین بریلی میں تبادلہ ہو گیا۔ آخر ترقی کر کے آگرہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ افراتفری کے باعث آگرہ نہ جا سکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام رہا۔ بغاوت کے اہتمام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی۔[1]

انڈیمان کی زندگی

انڈیمان میں ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، تاہم حافظے کی بنا پر علم صیغہ و تاریخ حبیب الہ وغیرہ کتابیں مرتب کر دیں۔ پھر ایک

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۱

انگریزی کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کردیا اور یہی ترجمہ مفتی صاحب کی رہائی کا ذریعہ بنا۔[1]

واپس آکر کان پور میں مدرسہ فیض عام جاری کیا۔ ۱۲۷۹ھ میں حج کے لیے گئے۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جدہ کے قریب پہنچے تو جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ دوسرے عازمین حج کے ساتھ یہ بھی سمندر میں ڈوب گئے۔ اور درجہ شہادت پایا۔ یہ ۱۷ر شوال ۱۲۷۹ھ (۷ر اپریل ۱۸۶۳ء) کا واقعہ ہے۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری میں مرقوم ہے:

> یہ نہایت ہی متقی و متورع و متبحر فاضل تھے۔ علمار ربانین میں شمار کیے جاتے تھے۔[2]

چاندپور کے رئیس

میر صادق اور میر رستم علی چاندپور ضلع بجنور کے رئیس تھے انھوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی وہ عرضداشت کا غذات دفتر شاہی میں مل گئی۔ بس صرف اس بنا پر ان کا تعلقہ ضبط کر لیا گیا۔

یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر شیکسپیئر نے سر سید مرحوم کو ۱۸۵۷ء کی شاندار خدمات میں دینا چاہا تھا۔ سر سید نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میرا ارادہ ہندوستان چھوڑ جانے کا ہے لہٰذا جاگیر کو کیا کروں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میں ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھانا چاہتا۔[3]

محمد شفیع بریلوی

یاد ہوگا کہ خان بہادر خاں کو جب بریلی میں حاکم بنایا گیا تھا تو قومی قوت کو اٹھانے اور منظم طریق پر انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے جن لوگوں نے امتیازی سرگرمیاں دکھائی تھیں، ان میں بخت خاں کے علاوہ محمد شفیع بھی تھا۔ اسے رسالدار کا منصب حاصل تھا۔ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ رسالے کے افسر اعلیٰ میکنزی نے محمد شفیع کو رد کنے کی ہر چند کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔

---

۱ محمد الحق تاریخ جلد دوم صفحہ ۳۰۹ ۲ تذکرہ مشاہیر کاکوری صفحہ ۲۰۹ ۳ حیات جاوید حصہ اوّل صفحہ ۔۔۔

توپ خانہ بریلی پر قبضہ کیا اور علم سبز لہرا دیا۔ نواب بہادر خاں کے ساتھیوں میں ہو کر انگریزوں سے لڑتا رہا، آخری زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے[۱]

لال بہادر خاں میواتی

اصل وطن الور تھا، کچھ مدت الور میں ملازم رہا، پھر سرکار انگریزی میں بھی ملازمت کی۔ اس کے رشتہ دار فتح پور سیکری میں مقیم تھے۔ جب ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے، نیمچ اور نصیر آباد کی فوجیں آگرہ پہنچیں تو لال بہادر خاں بھی ساتھ ہو گیا اور آگرہ کے قلعے تک پہنچ کر لوٹا۔ دہلی کی تسخیر کے بعد انگریزی راج کی فوج آگرہ بھیجی گئی۔ میواتیوں نے فتح پور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر انگریز کامیاب ہوئے اور میواتیوں کو بُری طرح تباہ کیا گیا۔ آگرہ سے دو شالہ مراکش نے میواتیوں کی سرکردگی قبول کر لی تھی، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی لال بہادر خاں ہاتھ نہ آیا[۲]

اصحاب پٹنہ

پٹنہ میں افراتفری کی خبریں پھیلیں تو مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ایک مجسٹریٹ مولوی مہدی کو شبہات میں گرفتار کر لیا گیا وارث علی ترہٹ میں پکڑا گیا اور اس کے قبضے سے خط نکلے جنہیں باغیانہ قرار دیا گیا اور معلوم ہوا کہ پوری تحریک کی روح رواں مولوی کریم تھا جو پٹنہ سے قریباً ۵ میل کے فاصلے پر رہتا تھا اور بڑا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ اسے بر وقت خبر مل گئی اور گرفتار نہ ہو سکا۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق رہا ہوئے۔ آخر الذکر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ، ان کے بھائی مولانا یحییٰ اور مولانا عبد الرحیم کو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں بہ جرم اعانت مجاہدین ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ وارث علی کو پٹنہ میں پھانسی دی گئی، پیر علی خاں لکھنوی، شیخ گھسیٹا اور لطف

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۲۲، ۱۲۳ [۲] ایضاً ص ۱۲۴

اپیل کی گئی تھی۔ بعد میں جلسے ہوتے رہے۔ ۱۶ جولائی کو ایک بڑے ہجوم نے ریزیڈنسی پر حملے کی تیاری کی، مولوی علاؤ الدین اس کے لیڈر تھے۔ راستے میں طرہ باز خاں روہیلہ جمعدار بھی اپنے آدمیوں کو لے کر حملہ آوروں میں شریک ہو گیا۔ ریزیڈنسی سے توپیں چلنی شروع ہوئیں حملہ آور پہلے پہل اِدھر اُدھر چھپ گئے، پھر منتشر ہو گئے۔ مولوی علاؤ الدین اور طرہ باز خاں کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا اور وہ روپوش ہو گئے۔

۲۲ جولائی کو طرہ باز خاں گرفتار ہوا۔ وہ بیچارا مقابلے میں سخت زخمی ہو چکا تھا۔ مقدمے میں اس کے لیے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں وہ قید سے نکل بھاگا اور جنگل میں چلا گیا۔ تعاقب کیا گیا۔ دوبارہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش میں شہادت پائی۔ نعش حیدرآباد لائی گئی۔ بعد شہادت اس کے پاس سے دو تلواریں، ایک طپنچہ، دس روپے اور کچھ آنے برآمد ہوئے۔ شہادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ۲۳ فروری ۱۸۵۹ء کا واقعہ تھا۔

مولوی علاؤ الدین کے لیے بھی کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سزا کے وقت اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ چنانچہ وہ انڈیمان گیا اور سرسٹھ سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ گویا کہ تبیس سال انڈیمان میں گزارے۔ بارہا رہائی کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ مولوی علاؤ الدین کا تعلق ایک پرانے علمی گھرانے سے تھا اور وہ خود اعلیٰ پائے کا عالم اور پرہیزگار بزرگ تھا۔

حکیم محمد عبد الحق

حکیم محمد عبد الحق بن محمد حسن بخش، اصل وطن دہلی تھا۔ مدت تک راجہ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ کے ایجنٹ رہے[۱]۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ بلبھ گڑھ میں دیوانی پر مامور تھے، خوب روپیہ پیدا کیا اور مالدار ہو گئے۔ پھر

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۳۷

ملازمت سے مستعفی ہو کر گھر آگئے۔ چونکہ میرزا احمد اور جے سنگھ راؤ کے لڑکوں کی وجہ سے نواب حامد علی خاں کے ہاں آنا جانا تھا، اس لیے پھانسی دی گئی۔

میرٹھ ریکارڈس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب بہادر شاہ کے ایڈیکانگ بن گئے تھے۔ ان کے ماتحت چار سو سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا، جو انگریزی فوج سے لڑا ان میں سے دس بارہ مقتول و مجروح ہوئے۔ اس فوج میں حکیم صاحب کا ایک عزیز اکبر علی جمعدار تھا۔ وہ بھی زخمی ہوا تھا اور زخموں کی وجہ سے وفات پائی[1]

حکیم صاحب باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے جو جنگ کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ ضلع گڑگانوہ کا انتظام ان کے سپرد تھا[2] بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا بلبھ گڑھ نے ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء کو ایک عرضی دی تھی، جس میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپے کا الزام لگایا گیا تھا[3] ایک مقام پر ذکر ہے کہ حکیم صاحب دربار میں آئے اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے[4]

ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی[5]

جنرل نیاز محمد خاں

یہ بھی بڑے مجاہدوں میں سے تھا۔ خوب لڑتا رہا۔ آخری شکست کے بعد مکہ معظمہ چلا گیا تھا۔ کئی سال وہاں گزارے، پھر ہندوستان آیا تو نواب جوناگڑھ کے پاس ملازم ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں پہچان لیا گیا۔ گرفتار ہوا اور مقدمہ چلا جس میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ نے سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا۔ انڈیمان ہی کی آغوش میں آسودہ ہے۔

---

[1] میرٹھ ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم ص ٣٦٢ [2] جلد ہفتم حصہ دوم ص ٣٦٢

[3] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ٥٦ [4] ایضاً ص ١٢٧

[5] میرٹھ ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اول ص ٣٦٣